بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جس طرح کسی شخص کے جسمانی ڈھانچے کا زیادہ تر مدار ریڑھ کی ہڈی پر ہوتا ہے بالکل اسی طرح کسی معاشرہ کا نظم اس کے اجتماعی اخلاق سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کا انفرادی اخلاق بھی معاشرہ کی اخلاقی صحت کو برقرار رکھنے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے لیکن جس اندازِ فکر کو لوگ اجتماعی شعور کے نام سے جانتے ہیں وہ درحقیقت کسی معاشرے اور قوم کی عظمت اور برتری کا ضامن ہوتا ہے۔

آپ اگر معاشرہ کے اندر چل پھر کر لوگوں کے خیالات کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ جملہ اکثر زبانوں سے ادا ہوتا سنائی دے گا: "لوگ نیک اور اچھے ہو جائیں تو حکومت خود بخود اچھی ہو جائے گی"۔ عوام تو ایک طرف رہے بسا اوقات پڑھے لکھے لوگ بھی اسی رائے کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انسان حیرت زدہ ہو کر یہ سوچتا ہے کہ جس ملک میں لوگ اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اثرات سے اس حد تک ناواقف ہوں، اس ملک کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے۔ اس انداز پر سوچنے والے غالباً معاشرہ کے افراد کو اینٹوں پر قیاس کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اگر اینٹیں پکی ہوں تو جو عمارت بھی ان سے تیار کی جائے گی وہ بھی لازمی طور پر مستحکم ہو گی۔ یہ طرزِ استدلال دو مفروضات پر قائم ہے۔ ایک یہ کہ اینٹیں تیار کرنے والے بھٹے کا انتظام جس مالک کے ہاتھ میں ہے وہ عمدہ اور پختہ اینٹیں ہی بنانا چاہتا ہے اور دوسرے یہ کہ پختہ اینٹیں لازمی طور پر ایک ایسے ماہرِ فن کے ہاتھ آئیں گی جو ان سے ایک پختہ اور مستحکم عمارت بنانے کا خواہشمند ہو گا۔ لیکن اگر بھٹہ کا مالک ہی بددیانت ہو اور لوگوں کو نیم پختہ اینٹیں ہی فراہم کرنے پر مصر ہو تو پھر ایک عمدہ اور مستحکم عمارت کس طرح معرضِ وجود میں آ سکتی ہے۔ اور بالفرض اگر پختہ اینٹیں بھی فراہم ہو جائیں پھر بھی مستحکم عمارت

کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ عمارت تعمیر کرنے والا ان اینٹوں کے ڈھیر میں سے بڑی فراست کے ساتھ اچھی اور پختہ اینٹوں کو منتخب کر کے انہیں اُن کے صحیح مقام پر پیوست کرے - اس کے علاوہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں نہ صرف بڑی ہُنر مندی اور چابکدستی کا مظاہرہ کرے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ چپکانے میں جو مسالہ استعمال کیا جائے وہ بھی بڑا عُمدہ ہو - ان ساری تدابیر سے بڑھ کر ان پکی اینٹوں کی افادیت کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ فنِ تعمیر کا کوئی ماہر نیک عزم کے ساتھ اچھے نقشہ کے مطابق عمارت تعمیر کرنے کی غرض سے انہیں استعمال کرے - اگر ماہر فن خدا ترس اور نیک ہو تو وہ ان اینٹوں کی مدد سے مسجد تعمیر کر کے بندگانِ خدا کو اپنے مالک اور خالق کے حضور جھکنے کے لیے نہایت موزوں جگہ فراہم کر سکتا ہے - اور اگر ماہر فن کو فسق و فجور سے محبت ہو تو وہ ان پکی اینٹوں سے میکدہ اور بدمعاشی کے دوسرے اڈے تعمیر کرتا ہے - پکی اینٹ تعمیر کرنے والے کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہوتی ہے -

---

بعض لوگ اس طرزِ استدلال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ اینٹیں تو بے جان اور بے ارادہ ہوتی ہیں اس لیے انہیں جاندار اور صاحبِ ارادہ انسان پر قیاس کرنا غلط ہے - یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے اس اعتراض سے یہ حقیقت ضرور منکشف ہو جاتی ہے کہ انفرادیت کے یہ علمبردار اجتماعیت کی غیر معمولی طاقت کا اچھی طرح شعور نہیں رکھتے - افراد بلاشبہ اینٹوں کی طرح بے شعور اور بے ارادہ نہیں لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کے اندر محض شعور اور ارادہ کی موجودگی انہیں اجتماعی قوتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بننے سے محفوظ رکھے - انفرادی شعور اور احساس اور انفرادی عزم اور ارادہ نہ تو از خود اجتماعی قوت میں ڈھلتے ہیں اور نہ ان میں خود بخود یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لیں کہ ہر اس نظریے اور نظام سے ٹکرا جائیں جو ان کے مزاج سے مغائرت رکھتا ہو - جس طرح آکسیجن اور ہائیڈروجن کا محض وجود اس بات کی ضمانت نہیں کہ انہیں بہر حال ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر پانی کی صورت میں نمودار ہونا ہے بالکل اسی طرح کسی معاشرہ میں نیک افراد کی موجودگی اس بات کی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ معاشرہ کو لازمی طور نیک ہی بننا ہے - اگر گیسیں مختلف نوعیتوں کے طبیعیاتی مراحل سے گزر کر ہی پانی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو یہ پاکباز اور بااخلاق افراد بعض صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد ہی ایسی اجتماعی قوت کو جنم دیتے ہیں جس کی مدد سے بھلائی کو فروغ اور بُرائی کا استیصال ممکن ہوتا ہے اور انفرادی نیکی اور پارسائی کو برومند ہونے کے

پورے مواقع میسّر آتے ہیں۔ انفرادی شرافت کی حیثیت معاشرے میں لَو کی سی ہوتی ہے جس سے بلاشبہ دل کا کوئی گوشہ منور ہو جاتا ہے مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ لَو آندھیوں کی زد سے محفوظ رہے لیکن اگر فسق و فجور خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر کے کسی معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو انفرادی پاکبازی کے یہ مدہم اور منتشر دیے آخر کس طرح خوفناک طوفانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ وہ آج نہیں تو کل گُل ہو جائیں گے۔ اس لیے نیکی اور شرافت کی ان قندیلوں کو روشن رکھنے اور ان کی مدد سے معاشرے کو بقعۂ نور بنانے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ خیر اور بھلائی کے یہ چراغ جس تیل سے جل رہے ہیں اس میں کسی طرح کمی نہ آنے پائے۔ دوسرے انہیں آندھیوں کے حملوں سے ہر صورت میں بچایا جائے۔

ہم اسے مسلم قوم کے متعدد تاریخی المیوں میں سے ایک عظیم المیہ سمجھتے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کے اندر انفرادی نیکی کا شعور اور احساس تو ہر مرحلہ پر کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے لیکن اس نیکی کو اجتماعی قوت بنانے کے احساس میں وہ تسلسل نظر نہیں آتا جس کی اس اُمت سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کے کئی ایک وجوہ ہیں جن میں بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود اسلام کے اجتماعی نظام سے کسی مرحلہ پر بھی صریحاً انحراف کی جرأت نہیں کی اور اگر کسی دیوانے نے ایسا کیا تو اس کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا گیا۔ اس بنا پر مصلحینِ اُمت اپنی زیادہ تر توجہ لوگوں کی انفرادی اصلاح پر صرف کرتے رہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں پر جو سیاسی نظام مسلّط رہا اسے اگرچہ بادشاہت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اس بادشاہت نے کسی عہد میں بھی آمریت کی صورت اختیار نہیں کی۔ مسلمانوں میں بہت کم ہی کوئی ایسا فرمانروا پیدا ہوا ہوگا جس نے اپنے سارے جاہ و جلال کے باوجود اپنے آپ کو ان معنوں میں مطلق العنان سمجھا ہو کہ وہ احکامِ شریعت کو پامال کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے غلط اعمال کی کوئی توجیہہ اور تعبیر پیش کر دی لیکن انہیں یہ جسارت کبھی نہیں ہوئی کہ وہ اپنے عزائم اور ارادوں کو شریعت سے بالاتر سمجھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے تابع اور شریعت کا خادم ہی ظاہر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام میں اجتماعی شعور پیدا کرنے کی ماضی میں اشد ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

اس کے علاوہ سابقہ ادوار میں ملکی انتظام و انصرام کے جو قوانین اور ضابطے رائج تھے اور جنہیں حکومت

قوت کے زور سے نافذ کرتی تھی وہ اتنے ہمہ گیر نہ تھے کہ پوری معاشرتی زندگی براہِ راست ان کی تحویل میں آجاتی اور انفرادی زندگی کا دائرۂ کار یکسر معدوم ہو کر رہ جاتا۔ اُس دور میں حکومت اپنے آپ کو صرف دو کاموں کی ذمہ دار سمجھتی تھی: دفاعِ وطن اور داخلی انتشار سے قوم کا تحفّظ۔ ثانی الذکر ذمہ داری میں معاشرے کے اندر عدل و انصاف کا قیام اور معاشی استبداد سے نجات کے فرائض بھی شامل تھے۔ ان چند ذمہ داریوں کے علاوہ حکومت پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی۔ اس بنا پر اُمت کے بہی خواہ ملک کے اندر اصلاحِ احوال کے لیے جو کچھ چاہتے بڑی آزادی سے کر سکتے تھے۔ نیک دل بادشاہ تو نیکی اور بھلائی کو پھیلانے کے لیے خود کوشاں ہوتے اور ان تمام افراد اور اداروں کی سرپرستی کرتے جو اس فرض کی انجام دہی میں مصروف ہوتے مگر بگڑے ہوئے فرمانروا بھی عوام کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ چنانچہ ان کی آوارہ مزاجی کے بُرے اثرات محلات تک محدود رہتے۔ عوامی زندگی فسق و فجور کی زد میں آنے سے محفوظ رہتی۔

ظاہر بات ہے کہ جس معاشرہ میں حکومت کا دائرہ کار محدود ہو، وہاں انفرادیت کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے غیر معمولی مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ماضی میں انفرادیت پسندی کے رجحان کو خوب تقویت حاصل ہوئی۔ یورپ میں اس رجحان نے ایک خوفناک قسم کی رہبانیت کو جنم دیا جس سے معاشرتی زندگی تہ و بالا ہو کر رہ گئی۔ خدا سے محبت کرنے والے افراد نے معبودِ حقیقی کی تلاش میں سارے انسانی رشتوں کو خیرباد کہہ کر صحراؤں اور بیابانوں کا رُخ کیا اور وہاں گیان دھیان میں اس حد تک منہمک ہوئے کہ انھیں انسانوں کے حالات کی کوئی خبر نہ رہی۔ معاشرے کے بگڑے ہوئے افراد نے جب یہ دیکھا کہ نیکی اور خدا ترسی اجتماعی زندگی کے سارے گوشوں سے از خود سمٹ کر جنگلوں کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور انسانیت اور اس کے معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تو انھوں نے نیکی کے اس خلا سے خوب فائدہ اُٹھایا اور اجتماعی زندگی کو فسق و فجور سے معمور کر دیا۔ مسلم معاشرے میں بلاشبہ تعلق باللہ نے رہبانیت کی ہیبتناک صورت تو کبھی اختیار نہ کی لیکن خارجی اثرات کی وجہ سے اس کے ہاں یہ تاثر ضرور پیدا ہوا کہ خدا سے محبت کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ خصوصاً سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر بس اس سے اس طرح دامن کش رہنا چاہیے کہ اس "خبیث درخت" کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے نہ پائیں۔ چنانچہ مسلم ممالک میں رہبانیت کے یہ رُوح فرسا مناظر تو دکھائی نہیں دیتے کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار

کرنے کی غرض سے لاکھوں کی تعداد میں صحراؤں کا رُخ کر رہے ہیں اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اُن کے اجتماعی نظم کی باگ ڈور ہے وہ بڑی آزادی کے ساتھ شہروں کے اندر فسق وفجور پھیلانے میں مصروفِ عمل ہیں اور اس طرح ایک معاشرہ تضاد کا یہ بھیانک نقشہ پیش کر رہا ہے کہ بیابانوں میں تو خدا کی پرستش ہو رہی ہو اور شہروں یعنی تہذیب وتمدّن کے مراکز میں پوری دلجمعی کے ساتھ شیطان پوجا جا رہا ہو۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا اور شیطان کی بیک وقت پرستش اور اس سے پیدا ہونے والی ہولناکیوں سے مسلم معاشرہ کافی حد تک محفوظ رہا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ خیال کسی نہ کسی صورت میں جاگزیں رہا ہے کہ مسندِ اقتدار "دنیا داری" کا سب سے بڑا مظہر ہے اور اس کے حصول کی جدوجہد صرف ان لوگوں کو زیب دیتی ہے جو خدا سے اپنا تعلق توڑ چکے ہوں۔ جن حضرات کو حق تعالیٰ کی قربت کی آرزو ہے انہیں بُرائی کے اس مرکز سے دُور ہی رہنا چاہیے۔

مسلم معاشرے کے خدا ترس اور نیک افراد کی سیاست کے بارے میں اور خاص طور پر مسندِ اقتدار کے متعلق خوف کی سی کیفیت کی ایک وجہ وہ عظیم ذمہ داری بھی ہے جو اسلام مسلمان حکمرانوں پر عائد کرتا ہے۔ قرآنِ مجید اور احادیثِ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم میں جس انداز سے اقتدار کی آزمائشوں کا ذکر ملتا ہے ان کے تصوّر سے انسان کانپ اُٹھتا ہے۔ مسندِ اقتدار کا خیال آنے کے ساتھ ہی یہ خیال بھی اس کے ذہن میں آتا ہے کہ وہ کند چھُری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے خالق ومالک سے ڈرنے والا مسلمان جب بھی اقتدار کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں اُن حکمرانوں کا نقشہ نہیں آتا جو عوام پر اپنی خدائی قائم کرنے کے لیے ان کی گردنوں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور حکومت کے وسیع ذرائع و وسائل کو بلا روک ٹوک اپنی عیاشیوں پر صرف کرتے ہیں۔ ایسے بدقماش حکمران جنھیں عوام کی فلاح وبہبود کی تو کوئی فکر نہیں ہوتی بلکہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد انہیں ایک ہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ کس طرح اپنے عہدِ اقتدار کو زیادہ سے زیادہ طول دیا جائے اور ملک اور قوم کے وسائل سے، جن کے وہ امین بنائے گئے ہیں، اپنی ذات، خاندان کے افراد اور اپنے حاشیہ برداروں کو بھرپور نفع پہنچایا جائے؟ اس قسم کے بگڑے ہوئے حکمرانوں کے لیے کسی مسلمان کے دل میں شدید جذبۂ نفرت

کے علاوہ اور کونسا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اُسے یہ حکمران فرعون، نمرود، شدّاد اور ہامان کے ٹولہ میں شامل نظر آتے ہیں جو خدا کے عذاب کے مستوجب ہیں۔ آخرت پر ایمان رکھنے والا مسلمان جب مسندِ اقتدار پر اس طرح آبرو باختہ لوگوں کو فائز دیکھتا ہے اور قرآن مجید اور احادیث میں ان کے لیے دردناک عذاب کی جو وعید آتی ہے اسے سُنتا ہے تو وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ اس آزمائش سے جس قدر ہو سکے دامن بچایا جائے۔

حکمرانی اور فرمانروائی کے اس گھناؤنے اور بھیانک تصور کے برعکس ایک مسلمان کے ذہن میں عقیدہ اور ایمان کی سی تابندگی کے ساتھ وہ مقدس تصوّر بھی ہمیشہ موجود رہا ہے جو تاریخ میں "خلافت" کے روشن عنوان کے ساتھ آج تک موجود ہے اور جس تصوّر نے نہ صرف مسلم قوم کو رہبانیت کے چنگل میں گرفتار ہونے سے بچایا ہے بلکہ پوری نوعِ بشری کو اجتماعی مسائل عدل و انصاف کی بنیاد پر حل کرنے کی دعوت دی ہے۔ خلافت سے انسان نے یہ سبق سیکھا ہے کہ حکومت اور فرمانروائی خدا کی طرف سے ایک مقدس امانت ہے اور اگر اس امانت کا بار خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر اور اس کے احکام کے مطابق اُٹھایا جائے تو اس سے اللہ رب العزت کی نظر میں "امین" کا درجہ دوسرے پاکبازوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ چنانچہ اجتماعی ذمہ داریوں سے دامن بچا کر زندگی گزارنا خداوند تعالیٰ کے نزدیک کوئی پسندیدہ طرزِ عمل نہیں بلکہ بسا اوقات یہ قابلِ مواخذہ فعل ہے کیونکہ اس میں اس بات کا خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ ملک کی زمامِ کار فساق و فجار کے ہاتھ میں آجائے جو عوام کو اللہ کے دین سے برگشتہ کرنے میں اپنی توانائیاں اور وسائل صرف کرنے لگیں۔ خلفائے راشدین جس احساسِ ذمہ داری، جس خلوصِ نیّت، جس دلسوزی، جس عزم و تدبر اور جس جذبۂ ایثار، جس عدل و انصاف اور جس للّٰہیت کے ساتھ اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے اُن کی سرگرمیوں کی جس انداز سے مدح فرمائی اُس نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اجتماعی معاملات میں عدم دلچسپی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ان معاملات کو عبادت سمجھ کر سرانجام دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح انفرادی زندگی میں عائلی اور معاشرتی ذمہ داریوں سے فرار کسی شخص کو اللہ کا محبوب نہیں بنا سکتا بالکل اسی طرح ملک اور قوم کے اجتماعی معاملات سے بے تعلقی کسی فرد یا گروہ کی روحانیت میں اضافے کا باعث نہیں بن سکتی۔ اللہ تعالیٰ آخر اس طرزِ عمل کو کس طرح پسند کر سکتا ہے کہ اس کی مخلوق کو تو خدا کے خوف سے عاری لوگ ستاتے اور ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناتے رہیں اور اللہ کی محبت کا دم بھرنے والے اس ظلم و ستم کے خاموش

تماشائی بن کر نظارہ کرتے رہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہی ایک مسلمان کا مطلوب و مقصود ہے لیکن خود خداوند تعالیٰ نے ہی اس مقصد کے حصول کے لیے جو راستہ متعین فرمایا ہے وہ صحراؤں اور بیابانوں میں سے نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے ہنگاموں میں سے گزر کر جاتا ہے۔ دنیا میں آج تک مذہب کی علمبردار جتنی قومیں بھی گزری ہیں ان میں سب سے زیادہ اس راز کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقائے کار نے پایا ہے۔ انہوں نے اپنی مقدس سرگرمیوں کے ذریعے جن کا مقصد رضائے الٰہی کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہ تھا پوری انسانیت پہ اس راز کو آشکارا کیا کہ اجتماعی زندگی کو اس عدل و انصاف پر قائم کرنا جس پر کہ خالقِ کائنات نے اس کائنات کو پیدا اور قائم کیا ہے، خدا کا قرب حاصل کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

مسلمان اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک عادل فرمانروا خدا کی نظر میں جس بلند مرتبے اور مقام کا حامل ہے، وہ اُس درویش سے کہیں زیادہ ارفع ہے جو اپنا زیادہ تر وقت اذکار و نوافل میں صرف کرتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ خدا کے ہاں سب سے زیادہ مستجاب الدعوات سلطانِ عادل ہی ہے اور اس پر رحمتِ خداوندی اس روز خاص طور پر سایہ فگن ہوگی جس دن خدا کے سایے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ایک مسلمان اس حقیقت سے بھی پوری طرح شناسا ہے کہ اُمتِ مسلمہ میں جو عظمت خلفائے راشدینؓ اور ان کے نقشِ قدم پہ چلنے والے عمر ثانیؒ اور بعض دوسرے صالح فرمانرواؤں کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے فرد کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو شخص مسندِ اقتدار پہ فائز ہو کر انسانوں میں اپنی خدائی کا سکہ چلانے کے بجائے خدا کی بادشاہت قائم کرتا ہے اور اس طرح نوعِ انسانی کو اس دنیوی زندگی میں ارحم الراحمین کی رحمت کے قریب لاتے اور اس سے متمتع ہونے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے، وہ کوئی معمولی حکمران تو نہیں ہو سکتا۔ "فقیری میں بھی شاہی" کا طرزِ عمل بلاشبہ ایک پسندیدہ طرزِ عمل ہے کیونکہ یہ کسی انسان کی خدا سے محبت اور دنیا سے بے نیازی کی دلیل ہے لیکن "شاہی میں فقیری" کا سا انداز پہلے طرزِ عمل سے کہیں زیادہ قابلِ احترام اور مستحسن ہے کیونکہ اس میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا پرتو ملتا ہے۔ جو شخص مال و دولت سے محروم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس سے مستغنی سمجھتا ہے وہ یقیناً قابلِ قدر ہے لیکن اُس بلند انسان کی عظمت کا کیا مقام جو تخت و تاج کا مالک ہوتے ہوئے فقیرانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے اور قوم کے وسائل اس احتیاط کے ساتھ (باقی بر صفحہ ۴۷)

(بقیہ اشارات) استعمال میں لاتا ہے گویا کہ وہ خدا کے حضور میں کھڑا ایک ایک پائی کا حساب چکا رہا ہے۔ اس کا سر تاج سے مزین ہونے کے بعد غرور سے اونچا نہیں ہوتا بلکہ خدا کی بارگاہ میں جھکتا ہے۔ پھر تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد اس کی شان و شوکت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر اپنی عظیم ذمہ داریوں کا احساس بڑھ جانے کی وجہ سے فروتنی پیدا ہوتی ہے کہ نہ معلوم آخرت میں اس سے کس طرح کی باز پرس ہونے والی ہے۔

ایک مسلمان "شاہی میں فقیری" کی غیر معمولی قدر و قیمت کو اچھی طرح جاننے کے باوجود عملی اعتبار سے دوسرے مسلک یعنی "فقیری میں بھی شاہی" کو محض اس بنا پر اختیار کرنا پسند کرتا ہے کہ وہ پہلے مسلک کے مقابلے میں کہیں زیادہ سہل اور آسان ہے۔ وہ اپنے دل کو اس طرح سمجھاتا ہے کہ اس کے لیے تو اپنی ذاتی ذمہ داریاں ناقابلِ برداشت بوجھ بنی ہوئی ہیں وہ اجتماعی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ بسا اوقات وہ اس بات کا بڑے شد و مد سے پرچار بھی کرتا ہے اور سیاست، جو اجتماعی ذمہ داریوں سے متعلق حیاتِ انسانی کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے، کو ناپاک کھیل گردان کر بڑے مغرورانہ انداز میں اس سے دامن کش رہنے کا وعظ سناتا ہے۔

ممکن ہے ماضی میں جب اجتماعی زندگی کا دائرہ بہت ہی محدود تھا، کوئی مردِ درویش اس ناپاک کھیل سے یکسر الگ رہ کر اپنی روح کو پاکیزہ رکھنے میں کامیاب ہوا ہو، مگر دورِ جدید میں جو لوگ اس طرح کی باتیں کر کے اپنے غلط طرزِ عمل کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو فریبِ نفس کا شکار ہیں یا غرورِ نفس کے مہلک مرض میں مبتلا ہیں یا وہ عہدِ حاضر کی اجتماعی جکڑ بندیوں کے جابرانہ مزاج اور ان کی نوعیتوں سے یکسر ناواقف ہیں۔ یہ لوگ سیاست کو تو ناپاک کھیل کہہ کر عوام کو اس سے الگ رہنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن وہ اجتماعی زندگی کی اُن سرگرمیوں سے جو اس کھیل سے زیادہ ناپاک اور ایمان سوز ہیں کیوں الگ نہیں رہتے۔ دورِ حاضر کا کونسا تاجر ایسا ہے جو اس بات سے ناواقف ہے کہ ملکی معیشت میں سود اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح انسانی جسم کے اندر خون۔ پھر حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس برائی کی جن شدید الفاظ میں مذمت کی ہے وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ لیکن ان حقائق کو جاننے کے باوجود آج تک کسی خدا ترس تاجر کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ محض اس بنا پر اپنے کاروبار کی بساط لپیٹ

دے کہ اس میں سود کے اجزاء شامل ہیں۔ اس متضاد طرزِ عمل کا آخر اس کے علاوہ اور کیا سبب ہے کہ کاروبار اور تجارت سے فرد یا چند افراد کی ذات کو نفع حاصل ہوتا ہے اس لیے دولت سمیٹنے کے اس ناپاک فعل سے نہ تو وہ خود دست کش ہوتے ہیں نہ دوسروں کو دست کش ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ البتہ کارزارِ حیات سے الگ رہ کر خدا کی رضا جوئی کے غلط فلسفہ کی سیاسی زندگی کے دائرہ میں خوب اشاعت کی جاتی ہے۔ وہ غالباً اس لیے کہ سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے کا ان میں حوصلہ اور جرأت نہیں ہوتی۔

(بقیہ اسلام میں انسانی حقوق)

روشن خیالی کی مدعی دنیا آج تک ان سے زیادہ منصفانہ "قوانین" نہیں بنا سکی ہے، تو دوسری طرف یہ دیکھ کر دل پر ایک چوٹ لگتی ہے کہ ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جن کے پاس اتنا بلند پایہ قانون موجود ہے اور پھر بھی ہم ہدایت کے لیے اُن رہنماؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کے تصور میں بھی حق اور عدل کی یہ بلندیاں کبھی نہیں آتی ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر رنج یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اسلام کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے حکمراں آج دنیا بھر میں اپنے خدا اور اپنے رسول کی نافرمانی پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھے ہوئے ہیں۔